باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

علم کلام کی مشروعیت اور ضرورت واہمیت

نحمده و نصلی علیٰ رسوله الكريم، أما بعد

آج کل بعض ایسی تحریریں اور کچھ ایسے مضامین سامنے آئے جن میں اہلِ حق اکابرِامت کے ہاں متداول ''علم کلام'' (صحیح عقلی اصول کی روشنی میں دفاعِ حق کے شعبہ) پر سخت تنقید وتبصرہ کیا گیا ہے؛ حالاں کہ اس علم کلام کی مشروعیت اور ضرورت واہمیت کتاب وسنت سے ثابت شدہ مسئلہ اور سلف صالحین کے ہاں ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

۱۔ قرآن کریم سے علم کلام کا ثبوت:

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ادع الى سبيل ربک بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتي هي أحسن﴾

(آپ اپنے رب کی راہ کی طرف (کبھی) حکمت (علمی وعقلی دلائل) کے ذریعہ اور (کبھی) اچھی نصیحت (ترغیب وترہیب) کے ذریعہ دعوت دیجیے اور (جب علمی دلائل اور مباحثے کی نوبت آجائے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجیے۔ مستفاد از بیان القرآن)

۲۔ حدیث شریف سے علم کلام کا ثبوت:

قال رسول اللہ ﷺ: ''يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين و تأويل الجاهلين.

(رواه البيهقي في ''كتاب المدخل'' مرسلا، كذا في المشكاة)

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ علم ہر نسل کے عادل اور ثقہ لوگ حاصل کرتے رہیں گے، اور اس سے اہل غلو کی تحریفات، اہل باطل کے غلط دعاوی اور جاہلوں کی بے جا تاویلات کو دور کرتے رہیں گے)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد کے ذیل میں فرماتے ہیں:

’’نمبر۷: سلف کے بعد خلف میں جس طرح محرفین ومدعین ظاہر ہوتے رہیں گے اسی طرح ان ہی میں ایسے خادمانِ علم بھی ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے جو اَیسی تحریفات ودَعاویٰ کاذبہ وتاویلاتِ جاہلانہ کا رد کرتے رہیں گے؛ چناں چہ سب زمانوں میں دونوں سلسلے جاری رہے جو کہ مخفی نہیں؛ حتیٰ کہ اسی سلسلہ میں ہمارے وقت میں بھی دونوں جماعتیں موجود ہیں، محرفینِ حقائق کی بھی اور معرّفینِ حقائق کی بھی۔ پھر ان محرفینِ حقائق میں دو جماعتیں ہیں:

ایک وہ جو اَپنی جماعت جدا بنائے ہوئے ہیں اور اُن کا جدا ہونا سب کو معلوم ہے۔

دوسرے وہ جو اپنے کو اَہل حق کی جماعت میں داخل کہتے ہیں اور دوسروں کی نظر میں بھی وہ اَہل حق کے آحاد [افراد سمجھے جاتے] ہیں، یہ جماعت سخت خطرناک ہے؛ کیوں کہ ان کا باطل حق سے ممتاز نہیں ہوتا؛ اس لیے عوام تو عوام بعض خواص بھی ان کے باطل سے متاثر ہوجاتے ہیں؛ چناں چہ اس وقت ایسی ہی ایک جماعت اپنے کو ہمارے اَکابر کی طرف منسوب کرتی ہے اور اپنے آرائے مخترعہ اور اَہوائے مبتدعہ سے نصوص میں خصوص قرآن مجید میں تصرفات کر کے بزعمِ خود دِین کی خدمت کر رہی ہے۔

(ماخوذ از پیش لفظ ’’التقصیر فی التفسیر‘‘، حضرت مولانا تھانویؒ: صفحہ ۳۔ مکتبۃ البشریٰ)

۳۔ سلفِ صالحین کے تعامل سے علم کلام کا ثبوت:

جس طرح ایک جماعت کی طرف سے ’’قیاس‘‘ کے حجت شرعیہ ہونے کی مخالفت کی گئی، امام ابوحنیفہؒ وغیرہ فقہائے کرام کی گہری فقہی بصیرت کو ’’رائے‘‘ سے تعبیر کیا گیا۔

بعض طائفوں کی طرف سے ''تصوف'' کے مشروع اور مطلوب ہونے ہی میں کلام کیا گیا، بڑے بڑے صوفیائے کرامؒ کو مبتدع، ملحد، زندیق قرار دیا گیا۔

مگر محققین نے ہمیشہ اس میں تفصیل اور وضاحت سے کام لیتے ہوئے، حق وناحق اور مشروع وغیر مشروع کی تقسیم فرمائی۔

اسی طرح بہت سے اہل ظاہر فقہاء اور محدثین کی ایک جماعت ابتدا ہی سے انتہائی خلوص وللّٰہیت کے ساتھ ''علم کلام'' کی بھی مخالفت کرتی رہی؛ مگر ان حضرات کی اس پرخلوص نکیر اور مخالفت کے علی الرغم خیر القرون کے اواخر ہی سے اس علم کی بھی ضرورت محسوس کی گئی، اور اس سے اشتغال کو بھی خدمتِ دین کا ایک اہم حصہ قرار دیا گیا، پھر اس کے بہترین فوائد اور مثبت نتائج بھی مشاہد ہوتے رہے۔

چناں چہ ''قیاس'' اور ''تصوف'' وغیرہ کی طرح محققین کے نزدیک ''علم کلام'' کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہی ہے جس کے وہ سب مقاصد اور پھر ان کے نتیجے میں وہی سب مفاسد ہیں جو ان متذکرہ بالا مضامین میں بیان کیے گئے ہیں، اس قسم سے اشتغال رکھنے والے اہل باطل ہوتے ہیں۔

اس گروہ کے ماضی میں سب سے بڑے سرغنہ ''معتزلہ'' ہوئے ہیں، جب کہ دورِ جدید میں اس طبقہ کی سربراہی ''نیچری طبقہ'' (جدت پسندوں) کے پاس ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: وأضرهم تصنيفاً النيچريون........۔

''علم کلام'' کی دوسری قسم وہ ہے جس کو انھی اہل باطل کی تلبیسات وتشکیکات سے دین کی حفاظت اور انھی کے ردّ وابطال کے لیے وضع کیا گیا ہے، جس سے اشتغال رکھنے والے ماہرینِ فن ائمۂ کلام کو ''حجۃ الاسلام''، ''حکیم الاسلام'' اور ''متکلم اسلام'' جیسے وقیع اور عالی القاب سے ملقب کیا جاتا ہے، امام ابوحنیفہ، ابوالحسن اشعری، ابومنصور ماتریدی،

غزالی، رازی، شاہ ولی اللہ، امام نانوتوی، حضرت تھانوی رحمہم اللہ جیسے اکابر اُمت اور اساطین ملت کی بلند و بالا شخصیات اسی سلسلۃ الذہب کی زرّیں اور تابناک کڑیاں ہیں۔

دراصل یہاں دو الگ الگ چیزیں ہیں: ایک ہے علم کلام (عقلی علوم اور دیگر مادّی وسائنسی اصول) کے ذریعہ دین کو سمجھنا اور ماننا۔ اور جو چیزیں ہمارے لحاظ سے ان اصول پر پوری نہ اتریں ان کو رد کرنے یا ان میں تاویل کرنے کی کوشش کرنا، یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات میں پڑ جانا ——— یہ سب وہ الحاد وزندقہ ہے جس کے بارے میں سیدنا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کا یہ جملہ مشہور ہے:

”من طلب الدین بالکلام تزندق“

(جو شخص دین عقلی علوم کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بددین اور زندیق ہوجاتا ہے)

اور دوسری چیز ہے: عقل کی راہ سے دین پر کیے جانے والے اعتراضات کا صحیح عقلی اصول کی روشنی میں جواب دینا اور مدعیانِ عقل و دانش کو خود ان کے ہتھیاروں سے مغلوب و مجحوج کردینا، یہ دین کی وہ خدمت اور سعادت ہے جس سے ہر دور میں خواصِ امت اور آحادِ زمانہ ہی سرفراز کیے جاتے ہیں۔

ایک اہم ترین بات یہاں یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ اس مشروع ”علم کلام“ کی ضرورت واہمیت بھی اصلاً ان افراد و طبقات کے لیے ہے جن کو اہل باطل کی تحریروں اور کلام سے واسطہ پڑتا ہے؛ کیوں کہ تمام اہل الحاد اور اہل باطل کا قدر مشترک: تلبیس وتشکیک اور حق وباطل میں لَبس وخلط ہوتا ہے، جس کا فرق سمجھنے اور حق کو باطل سے ممتاز رکھنے کے لیے ان اصول کا جاننا ضروری ہوجاتا ہے جن کے ذریعہ اہل باطل کے غلط نظریات وافکار پر مطلع ہوکر ان سے اپنے عقیدہ وفکر کا تحفظ کیا جاسکے۔

چوں کہ آج کل ادبی تحریروں اور جدید اسلوبِ نگارش کا ذوق وشوق کافی بڑھ گیا ہے، اس لیے اس راستہ سے بھی، اور اس کے علاوہ اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کے واسطہ سے بھی دینی موضوعات پر مختلف مضامین آتے رہتے ہیں، اب ان میں کیا صحیح ہے کیا غلط؟ کون سے مضمون نگار اہل حق میں سے ہیں اور کون اہل باطل میں سے؟ کون سے مضامین کتاب وسنت کے اور جمہور امت کے مسلک کے مطابق ہیں اور کون سے ان کے معارض اور مخالف؟ ان سب پر اطلاع یابی اور بصیرت کے لیے ایسے بزرگوں اور علماء کی کتابوں سے بھی استفادہ اور اشتغال شرعاً اور عقلاً ضروری ہے جن کے ہاں ان موضوعات پر باقاعدہ گفتگو کی جاتی ہے؛ تاکہ اہل باطل کی تحریروں میں موجود زہر کا کچھ تریاق ہو سکے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ادبیت، سلاست اور زورِ بیان کے نام پر زہر آمیز تحریروں اور الحاد زدہ مضامین کی تو پوری پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اور جن اصول، کتابوں اور شخصیات سے ان کا تریاق واصلاح وابستہ ہے ان کو قدیم اور فرسودہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، فإلی اللہ المشتکیٰ۔

دین کے ہر اہم ''فکری'' اور ''فقہی'' مسئلہ میں ایک سے زائد آرا ہوتی ہیں، یا ہو سکتی ہیں؛ مگر ان میں ہمارے لیے حجت اور معیار وہ رائے ہوتی ہے جو ہمارے اکابر دیوبند نے اختیار فرمائی ہے، پھر اگر ان میں بھی اختلاف نظر آئے تو اکثر وبیشتر حضرت تھانویؒ کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

تجربہ یہی ہے کہ اگر اس اصول و معمولِ اکابر پر عمل کیا جائے تو ایسے مختلف فیہ مسائل میں قلبی انشراح اور فکری سلامتی حاصل رہتی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ خطرہ سے خالی نہیں۔!و باللہ التوفیق و ھو المستعان

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و أصحابہ أجمعین

و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العٰلمین

محمد معاویہ سعدی

مظاہر علوم سہارن پور

۱۱/۱۲/۱۴۴۰ھ